پنجاب کی دیہی ثقافت اور غلام الثقلین نقوی کا ناول ''میرا گاؤں''

Rural culture of Punjab and Ghulam-ul-Saqlain Naqvi's novel "Mera Gaon"

ڈاکٹر سید محمد مبشر رضا نقوی [i]

Abstract:

Ghulam-us-Saqlain Naqvi is a renowned Urdu author. His novel "Mera Gaon" has a storyline that resonates with every village in Punjab, despite having the specific rural settings. While the novel does not delve into any particular philosophical themes, it beautifully portrays the simplicity, innocence, and philanthropic nature of the rural Punjab community. Naqvi skilfully captures the cultural diversity prevalent in the rural areas of Punjab. Within the backdrop of social and political fervour, the novel prominently showcases the prevailing trend of philanthropy and profound love for one's soil and homeland. The narrative also presents the villagers' adherence to their local traditions, their unbiased participation in each other's joys and sorrows, and their ways of organizing the ceremonial events.

Keywords: *Ghulam-Us-Saqlain Naqvi, Rural Punjab, Cultural Diversity, Traditions, Ceremonial Events.*

غلام الثقلین نقوی اردو کے نام ور مصنف ہیں۔ ان کے ناول "میرا گاوں" میں ایک کہانی ہے جو مخصوص دیہی ماحول کے باوجود پنجاب کے ہر گاؤں میں گونجتی ہے۔ اگرچہ یہ ناول کسی خاص فلسفیانہ موضوعات میں شامل نہیں ہے ، تاہم یہ پنجاب کی دیہی برادری کی سادگی ، معصومیت اور انسان دوستی کو خوب صورتی سے پیش کرتا ہے۔ نقوی پنجاب کے دیہی علاقوں میں پائے جانے والے ثقافتی تنوع کو مہارت سے پیش کرتے ہیں۔ سماجی اور سیاسی پس منظر میں یہ ناول انسان دوستی کے مروجہ رجحان اور اپنی مٹی اور وطن سے گہری محبت کو نمایاں طور پر ظاہر کرتا ہے۔ یہ بیانیہ گاؤں والوں کی اپنی مقامی روایات کی پاسداری ، ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں ان کی غیرجانب داری سے شرکت ، اور رسمی تقریبات کے انعقاد اور ان کے طریقوں کو پیش کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو ادب ، ناول ، غلام أس ثقلین نقوی ، دیہی پنجاب ، ثقافتی تنوع ، روایات ، رسمی تقریبات۔

اردو ناول نگاری کے حوالے سے کئی نام ایسے ہیں جو اپنے ایک یا دو مطبوعہ ناولوں کے حوالے سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ غلام الثقلین نقوی کا شمار بھی انہی ناول نگاروں میں ہوتا ہے اور ان کا ناول ''میرا گاؤں'' اسی زمرے میں آتا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ناقدین ناول کے سماجی یا نفسیاتی حوالے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حال آں کہ وہ کہانی جس علاقے یا خطے سے تعلق رکھتی ہے، بین السطور اس کے ثقافتی مظاہر بھی ملتے ہیں۔ اس حوالے سے ہمارے یہاں بہت زیادہ تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا۔ اگرچہ اس پہلو کا سرسری تذکرہ تو ناقدین کرتے رہے ہیں مگر کلّی اعتبار سے ایسا کام آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ زیرِ بحث ناول ''میرا گاؤں'' دراصل غلام الثقلین نقوی نے چک مراد کو مدنظر رکھتے ہوئے

[i] استاد ، شعبہ اُردو ، گورنمنٹ علم دار حسین کالج ، ملتان (Corresponding Author)

لکھا ہے۔ اس میں گاؤں کے کلچر کے تمام لوازمات نظر آتے ہیں بالخصوص کسان، کھیت کھلیان، کھیل تماشے، شادی بیاہ، خوشی غمی وغیرہ۔ ''میرا گاؤں'' میں سیاست، بدلتا ہوا سماج، جدید دور کی تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ناول کے آغاز میں گاؤں میں خراس کی جگہ چکی کا لگنا اس کا نقطہ آغاز نظر آتا ہے مگر گاؤں کا بابا نتھو جو خراس کا چلانے والا ہوتا ہے۔ جب گاؤں میں چکی لگتے دیکھتا ہے تو وہ چکی کو شیطان کا کارخانہ کہتا ہے۔ اس کا یہ کہنا معنی خیز ہے:

> ''نجانے چودھری کو کیا سوجھی کہ شیطان کا چرخا اس گاؤں میں لے آیا۔ لوگ میلہ دیکھنے آئے ہیں۔ ہُوں میلہ ! ابھی شیطانی چرخا چلے گا۔ گھرر گھرر۔۔۔ اور پھر دیکھنا کیا ہو گا گاؤں سے ساری برکت اٹھ جائے گی۔ کبھی شیطان بھی انسان کا دوست بنتا ہے؟''[۱]

دراصل اس میں ہمیں ایک طرف بابا نتھو کو اپنا روزگار بند ہوتے ہوئے نظر آتا ہے اور دوسری طرف وہ خالصتاً دقیانوسی رویہ ملتا ہے کہ جس میں کسی نئی چیز یا تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا جاتا اور اس میں قباحتیں تلاش کر کے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی اور تسکین دی جاتی ہے۔ یہ ہمارے دیہی معاشرے کا مزاج ہے کہ وہاں کے باسی جب اپنے خوابوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھتے ہیں تو انہیں پھر مذہب اور اعتقاد کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ طرزِ عمل ہمیں ناول میں کئی جگہ نظر آرہا ہے جہاں نتھو چکی کی آواز کو شیطان کی آواز کہتا ہے اور اس کا اعتقاد ہے کہ اس مشین (چکی) کے چلنے سے علاقے سے خیر و برکت اٹھ جائے گی۔ یہ ہمارے برصغیر کے دیہی معاشرے کی سائیکی رہی ہے کہ ہر دور میں آنے والی نئی چیز کو شروع میں خلافِ حقیقت اور خلافِ شرع و مذہب سمجھتے ہیں اور اس سلسلہ میں مختلف توہمات اس سماج میں جگہ بنا لیتے ہیں مگر درحقیقت یہ تمام توہمات اس حقیقت سے آنکھیں چرانے کا عمل ہوتا ہے جو بدلتے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

''میرا گاؤں'' کا مطالعہ کریں تو ہمیں کہانی میں پنجاب کے دیہی کلچر کے کئی رنگ نظر آئیں گے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس پہلو کے حوالے سے ''میرا گاؤں'' پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے حالانکہ کسی بھی ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت سے کردار، واقعات ان ثقافتی متغیرات کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ یہی عناصر کہانی کی تشکیل میں مدد و معاون بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے دیہی سماج میں یہ رویہ قابل توجہ ہے کہ لوگ مختلف مواقع، تقریبات کو کسی نہ کسی قدرتی آفات کے حوالے سے یاد رکھتے ہیں۔

غلام الثقلین نقوی نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے:

> ''ہم گاؤں والے جب کسی بزرگ سے کسی گزرے ہوئے واقعے کی بابت پوچھتے، تو جواب میں کسی کال یا وبا یا سیلاب کا ذکر ہوتا، یہ بات اس سال کی ہے جب مینے والا کال پڑا تھا اور لوگ مینے اور بھوا کا ساگ کھا کھا کر بیمار پڑ گئے تھے اور بکھڑے کو پیس کر اس کی روٹیاں پکاتے تھے یا اس سال طاعون کی وبا پھیلی تھی اور لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے تھے یا اتنا سیلاب آیا تھا کہ گاؤں مٹی کا ڈھیر بن گیا تھا اور لوگوں نے ٹیلوں پر پناہ لی تھی۔''[۲]

ڈاکٹر طارق مجید نے ''میرا گاؤں'' کے حوالے سے تجزیہ کرتے ہوئے یوں بیان کیا ہے:

> ''زرعی معاشرے کے حسی تجربے، ان کے اظہار کے طریقے اور نظام فکر مختلف ہوتے ہیں۔ شہروں کی نسبت دیہاتی لوگ زیادہ ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ زلزلہ، سیلاب، آندھی، طوفان، اولے، قحط اور وباؤں کو عذابِ الٰہی سمجھنا، تقدیر پر ایمان رکھنا، جھاڑ پھونک، دعا، تعویذ، نذر و نیاز اور ٹوٹکے کی مدد سے اپنے بگڑے کام بنانے کی کوشش کرنا، مولویوں، پنڈتوں، پیروں، فقیروں کی خدمت کرنا اور درگاہوں اور مقبروں کی زیارت کو نجات کا وسیلہ سمجھنا اس زرعی نظام کی اعتقادی خصوصیات ہیں۔''[۳]

یہ اعتقادات، توہمات، دراصل اس حقیقت سے آنکھیں چرانے کا عمل ہے کہ جو اس علاقے کے لوگ دیکھنا نہیں چاہتے۔ انہیں پھر اس کے لیے کچھ تاویلیں گھڑنا پڑتی ہیں اور زیادہ تر تو مذہبی عقائد اور مزارات پر حاضری کو ان تلخ حقائق سے چھٹکارے کا باعث سمجھتے ہیں۔

اسی طرح اس ناول میں مختلف عمارتوں کی ساخت سے متعلق بھی جھلکیاں ملتی ہیں جس میں ہمارے پنجابی دیہی کلچر کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اگرچہ اکثر دیہی علاقوں میں یہ عمارتیں خواہ وہ کچی ہوں یا پختہ، معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تقریباً ایک سی ہی نظر آتی ہیں البتہ اپنے جغرافیائی تنوعات کی بنا پر ان عمارتوں کو خطوں اور رنگوں کے حوالے سے شناخت کیا جا سکتا ہے بالخصوص میدانی علاقوں کے مکانات، دیہاتی علاقوں کے مکانات، شہری علاقوں کے مکانات کو ہم ان کی ساخت کے اعتبار سے پہچان سکتے ہیں کہ ان کا تعلق کس علاقے سے ہو سکتا ہے۔ دیہی پنجاب کے مکانات میں کچی مٹی کا لیپ، مختلف رنگوں اور لکڑی کا ایک سا انداز ملے گا۔ ایسے کئی مناظر غلام الثقلین نقوی دکھاتے ہیں جہاں ان کمروں اور ان میں رکھے ہوئے برتنوں کا انداز

دکھایا گیا ہے:۔

"آنکھوں سے نیند کی دھند چھٹی تو کمرے کی ایک ایک چیز کسمسا کر جاگنے لگی۔ میری سب سے پہلی نظر لپی پوتی نیلگوں کی پڑ چھتی پر پڑی جہاں کانسی اور پیتل کے برتن چمک رہے تھے۔"[۴]

اسی ناول سے ایک دوسرا منظر دیکھیے جو اسی انداز کی عکاسی کر رہا ہے:

"آنگن کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ اس کی دیوار اور مکان کے سب سے بڑے کمرے "پسار" کی دیوار مشترکہ تھی۔ اس کوٹھڑی کا دروازہ آنگن میں کھلتا ہے۔ گاؤں والے اسے "جھلانی" کہتے ہیں۔ اس کوٹھڑی میں کھانے پکانے کے برتن، دہی بلونے کی چاٹی، گھڑونچی، اُپلے اور لکڑیاں پڑی تھیں۔"[۵]

ان دونوں اقتباسات سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ دیہی علاقوں کے بیشتر گھر اسی طرح کے ہوتے ہیں اور بالخصوص نچلے طبقے اور نچلے متوسط طبقے کے گھروں کا نقشہ تقریباً ایک سا ہی ہوتا ہے اور اس بات کی تصدیق ہمیں اردو کے دیگر ناولوں سے بھی ہو جاتی ہے۔ بالخصوص ان ناولوں سے جو دیہی پنجاب کے تناظر میں لکھے گئے ہیں۔ شوکت صدیقی کے ناول "جانگلوس" کی کہانی جو وسطی اور جنوبی پنجاب کے علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے، اس میں بھی کئی جگہ پر اس طرح کے گھروں اور وہاں کے کمروں اور برتنوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

دیہی پنجاب کا کلچر ہے کہ وہ اونچی جگہ پڑ چھتی یا لکڑی کے پھٹوں سے شیلف بنا کر وہاں برتن سجاتے ہیں اور وہ ایک قرینے سے رکھے جاتے ہیں۔ ان کے نیچے بچھانے کے لیے وہ کڑھائی والا کپڑا بھی استعمال کرتے ہیں تاکہ خوبصورتی بھی نظر آئے جب کہ دیوار پر سفید یا نیلا رنگ بھی کیا جاتا ہے۔ ماسی کے گھر کے حوالے سے غلام الثقلین نقوی یوں منظر کشی کرتے ہیں:

"ماسی اپنے گھر کو بہت صاف ستھرا رکھتی تھی۔ اندر کی دیواریں کھڑیا مٹی سے لپی ہوئی تھیں۔ ان میں نیل کا ہلکا ہلکا رنگ بھی شامل تھا۔ سامنے کی دیوار میں چھتی پر تانبے اور پیتل کے چمکتے ہوئے برتن سجے تھے۔ کمرے کے لپے پوتے کچے فرش پر دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ان میں سے ایک چارپائی کے پائے رنگین تھے اور یہ سُوت سے بُنی ہوئی تھی۔"[۶]

یوں ہمارے سامنے "میرا گاؤں" کے ذریعے پنجاب کی دیہی معاشرت کی ایک تصویر آجاتی ہے۔

غلام الثقلین نقوی نے "میرا گاؤں" میں دیہاتی علاقے کی ان جگہوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض دیہی علاقوں میں ان کا اب نام بھی نہیں لیا جاتا۔ بعض جگہیں تو ان کا ثقافتی مظہر ہوا کرتی تھیں۔ انہی جگہوں میں ایک شاملات یا تکیہ بھی ہوا کرتا تھا جہاں علاقے بھر کے سماجی اور ثقافتی میل ملاپ ہوا کرتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے مل کر دن بھر کا حال جان لیا کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن عرف ماہنا ان کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے:

> "گرمیوں میں سائے کے نیچے اور سردیوں میں دھوپ میں چٹائیاں بچھی ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے بچپن میں یہاں پنچائتیں لگتی دیکھی ہیں۔ یہاں گاؤں کی باراتیں آتیں، یہاں نٹ، بازی گر اور سپیرے اپنا تماشا دکھاتے، یہیں ایک دو بار رہس بھی لگی تھی پر میرے دیکھتے ہی دیکھتے تکیے کی بہار رخصت ہو گئی۔"[۷]

یہ اقتباس دراصل ہمارے ثقافتی زوال کی داستان ہے کہ وہ جگہیں جو لوگوں کے جوڑنے، خوش ہونے، زندگی کو زندگی بنانے کا ذریعہ تھیں وہ آج کہیں بھی نہیں ملتیں۔ شہری علاقے تو دور کی بات اب تو گاؤں میں بھی ایسی جگہیں تلاش کرنے سے نہیں ملتیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں اپنائیت، رواداری، تحمل اور برداشت رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے اور شاید آنے والی نسلوں کو ان رشتوں اور اقدار سے واجبی شناسائی بھی نہ رہے گی۔

اگرچہ ہمارے ناقدین ان تمام کا ذمہ دار سیاسی حالات اور بدلتی ہوئی اقدار کو قرار دیتے ہیں تاہم اس کا سدباب اور ان ثقافتی اقدار کا احیا ان کے نزدیک شاید بے معنی ہے۔ اس مشینی دور نے بہت سی روایتوں پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ ان روایات کی پاسداری بھی بہت دشوار ہوتی جارہی ہے۔ ان پرانی روایات اور اقدار سے رشتوں کی جڑت کچھ ایسی تھی کہ ذات، برادری، تعلق سے ہٹ کر بھی ایک دوسرے کے دکھ درد کا خیال رکھا جاتا تھا، انسانیت اور خلوص بھی پیشِ نظر رہتے تھے۔ انہی روایات میں سے ایک، فصل میں سے حصہ نکالنا بھی تھا اور اس میں اس بات کی کوئی قید نہ تھی کہ کسان چھوٹا ہے یا بڑا۔ ادنیٰ طبقہ کے لیے یا کم حیثیت طبقات کے لیے حصہ نکالنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر افضال بٹ "میرا گاؤں" میں فصل میں سے

حصہ لینے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ناول میں چھوٹے کسان کی زندگی کو بڑی تفصیل سے دکھایا گیا ہے۔ ایک کسان کس طرح تمام سال سخت محنت کرتا ہے۔ وہ جفاکشی اور دن رات خون پسینہ بہاتا ہے۔ غلے میں ان گنت مفت خور حصہ بانٹنے کے لیے آجاتے ہیں۔''[۸]

یہ تجزیہ اس حد تک تو درست ہے کہ جب ہم چھوٹے کسان کو اپنی فصل میں سے دوسروں کو حصہ دیتے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اور اس کی محنت سے یہ تمام لوگ مفت حصہ لے رہے ہیں۔ دراصل یہ وہ اقتصادی پہلو ہے جو کئی ناقدین کے سامنے موجود ہوتا ہے مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ اس اقتباس کے ذریعے انسان دوستی اور مثالیت پسندی کی مثال کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے:

> ''تب سِلا چگنے والیاں کھیت میں آگئیں۔ اس ٹولے میں لڑکیاں بھی تھیں اور عورتیں بھی۔ انھوں نے اپنی کھدر کی چادروں کی 'جھلونگیاں' بنائی ہوئی تھیں۔ میرے باپ نے کٹے ہوئے کھیت پر ایک نظر ڈال کر سِلا چگنے والیوں سے کہا: ''تم بھی آپہنچیں۔ اچھا چن لو اپنا دانہ دنکا۔ ریشم بیبیے! کچھ دانہ دنکا پنکھ پکھیروں کے لیے بھی چھوڑ دینا۔۔۔۔ دھرتی بڑی دیالو ہے۔ ریشماں! کسان کو تو اس کا امانت دار بنایا گیا ہے۔ سب کو اپنا نصیب ملنا چاہیے۔۔۔۔ ۔ یہ گاؤں کی ازلی ریت ہے کہ ہم کسانوں کی بہو بیٹیاں سِلا نہیں چگتیں کیوں کہ کٹائی کے دوران پودوں سے جھڑنے والی بالیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ کمیں کمیروں کا حصہ ہے یا ہم میں سے ان کا جن کے سر پر مردوں کا سایہ نہ ہو۔''[۹]

اسی پہلو پر دوسرا اقتباس دیکھیے تاکہ ہمیں اس حوالے سے تجزیہ کرنے میں آسانی ہو اور دو مختلف زاویے بھی بیک وقت ہمارے سامنے آسکیں۔

> ''جب بھوسہ الگ ہوا اور گندم کا چھوٹا سا ڈھیر لگا تو میرا جی بیٹھ گیا۔ لوہار، نائی، دھوبی اور مولوی اور دوسرے سپیوں کا حصہ دینے کے بعد گندم کا ڈھیر اور بھی کم ہو گیا تو میں نے سوچا، کسان کی کمائی میں کتنے لوگ شریک ہیں۔ مجھے ڈھوم ڈھاری، میراثی، شیخ، بھرائیں اور کھیت منگتے یاد آئے جو کٹتی فصل میں سے اپنے حصے لے کر جا چکے تھے اور سِلا چگنے والیوں

نے گراپڑا ہر خوشہ اٹھالیا تھا اور پنچھی پکھیرو بچے کھچے دانوں سے اپنے پوٹے بھر چکے تھے اور کسان کا ڈھیر گھٹتا رہا، گھٹتا رہا حتیٰ کہ چھے مہینوں کی محنت، سردی گرمی، بیماری، دکھ اور لہو پسینے کا ڈھیر اس سے بلند ہو گیا۔"[۱۰]

یہ دوسرا اقتباس ماہنے کی اس سوچ کا عکاس ہے جس کا تذکرہ ڈاکٹر محمد افضال بٹ کے اقتباس میں کیا جا چکا ہے کہ انتہائی نامساعد معاشی حالات اور سخت محنت کے بعد جب فصل کٹنے کا موقع آتا ہے تو کسان کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا کیوں کہ اس کی فصل سے دوسرے لوگ اپنا "حصہ" لے چکے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اس عمل کو کسان کے استحصال کے طور پر سمجھتے ہیں مگر غلام الثقلین نقوی نے ماہنے کے باپ کی زبان سے جب یہ سمجھایا کہ یہ غریب لوگ تو سارا سال اسی آس پر جیتے ہیں کہ فصل آئے گی تو انہیں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملے گا اور ماہنے کا باپ اس حصہ کو دینے کے بعد اطمینان محسوس کرتا ہے۔

یہی تو دیہی ثقافت کی خوبصورتی ہے کہ یہ طرزِ عمل اپنائیت اور انسان دوستی کو پیدا کرتا ہے اور مختلف طبقات کے لوگ ایک دوسرے سے گھل مل کر رہتے ہیں جب کہ بے سہارا اور بیوہ عورتوں کو فصل میں سے سِلا چگنے سے ایک طرح کی امداد ہو جاتی ہے اور وہ کم از کم خوراک کے حوالے سے کسی حد تک بے فکر ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ پہلو ہے کہ جس پر ہمارے ناقدین نے بہت کم لکھا ہے۔ اگرچہ ترقی پسند تخلیق کاروں نے پریم چند سے لے کر عہد حاضر تک اس حوالے سے افسانوں اور ناولوں میں اشارے تو کیے ہیں مگر ناقدین نے اس پہلو کے ایک رخ "معاشی استحصال" پر زیادہ زور دیا ہے اور دیہی ثقافتی حسن گہنا کر رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر طارق مجید کا کہنا ہے:

"ہمارا ادیب دیہی ماحول کو پیش کرنے میں کوتاہی سے کام لے رہا ہے جب کہ زیادہ تر ناول نگار شہری حالات و واقعات کو اپنے ناولوں کی زینت بنائے ہوئے ہیں۔ اگر وقت کے ادبا حضرات نے اس طرف توجہ نہ دی تو اردو ناول سے دیہی کلچر کی عکاسی بالکل معدوم ہو جائے گی۔ جب تک لہلہاتی کھیتیاں اور سرسبز باغات ہیں ادبا کرام ان کی طرف توجہ کرتے رہیں گے اور دیہی ثقافت پروان چڑھتی رہے گی اور اردو ناولوں میں دیہی معاشرت کی عکاسی ہوتی رہے گی۔"[۱۱]

دیہی کلچر کا ایک بڑا مظاہرہ شادی بیاہ کی تقریب پر ہوتا ہے۔ یہ وہ دیہی ثقافتی مظہر ہے جو اپنا منفرد

رنگ رکھتا ہے۔ اگرچہ مختلف علاقوں میں اپنے اپنے مقامی ثقافتی رسوم و رواج کو مد نظر رکھ کر تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے تاہم پنجاب کے زیادہ تر علاقوں میں فصل کی کٹائی کے بعد شادی بیاہ کی تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے کیوں کہ بیشتر مزارعوں اور ادنیٰ طبقات کو انہی دنوں کچھ معاشی آسودگی ملتی ہے مگر وہ ان تقریبات میں اپنے علاقے کی رہتل کو نہیں بھولتے۔

''میرا گاؤں'' میں غلام الثقلین نقوی نے اس ثقافتی مظہر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بالخصوص گاؤں کے چودھری کے گھر کسی کی شادی ہو تو تمام طبقات کے لوگ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں خواہ اس میں چودھری کا اثر رسوخ، اس کا ڈر یا کوئی دوسرا نادیدہ پہلو بھی ہو مگر گاؤں کے ریت رواج کے مطابق سب کچھ کیا جاتا ہے۔ غلام الثقلین نقوی نے شادی کے ثقافتی تنوعات پر اس انداز سے لکھا ہے کہ ہم بخوبی ایک ایک رسم کو نا صرف محسوس کر سکتے ہیں بلکہ ان کی حرکی تصویریں بھی ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ وہ گاؤں کی ثقافت کی جھلک کچھ اس طرح دکھاتے ہیں اور علاقے کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں کہ یہ ہمارے مجموعی دیہی کلچر کی عکاس بن جاتی ہے:

> ''ہر سال اس بیساکھ کے مہینے میں گاؤں میں کوئی نہ کوئی شادی ہوتی ہے۔ لڑکے کی شادی ہوتی تو بارات سجتی اور کسی دوسرے گاؤں میں جا کر ایک رات ہنسی خوشی میں بسر ہو جاتی۔ اگلی شام کو تھکی ماندی بارات لڑکی کی ڈولی لے کر گاؤں آتی تو بڑی بوڑھیاں، مٹیاریں اور بچے بچیاں اس کا استقبال کرتیں۔ ایک دو روز کے بعد مُنڈی کو ڈنڈ الگ جاتا اور مہمان ہنسی خوشی رخصت ہو جاتے پر جب گاؤں کی کسی بیٹی کی بارات آتی تو خوشی کے ساتھ غم کی لہر بھی آتی۔ گاؤں کی بیٹی سہیلیوں سے بچھڑتی، ماں باپ، بہن بھائیوں سے جدا ہوتی تو گاؤں کے در و دیوار روتے۔ ڈولی کو کندھا دینے والے پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھ کر گاؤں کی امانت دوسروں کے سپرد کر کے ایک عجیب سے غم میں کھو جاتے۔ گاؤں میں پلنے بڑھنے والی ہر لڑکی کا گاؤں کے ہر فرد کے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے بھائی، ممیر، چچیر نہ بھی ہوں، پھر بھی دل کا رشتہ تو ضرور قائم ہو جاتا ہے اور رشتہ ٹوٹے تو اس کا چھناکا بھی ہوتا ہے۔''[۱۲]

اس اقتباس میں بین السطور ہمیں وہ اپنائیت، چاہت، محبت اور اخلاص دکھائی دیتا ہے جو عہدِ حاضر

میں رفتہ رفتہ معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ چاہے اس کی کوئی بھی وجہ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ شہری زندگی کی چکاچوند نے گاؤں کی ثقافتی زندگی پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے اور وہاں بھی اب شہری انداز عام ہوتا جا رہا ہے جو ان کی ایسی ہی ثقافتی تقریبات میں شامل ہو چکا ہے مگر جس دور کی عکاسی غلام الثقلین نقوی نے کی ہے اس دور میں ہر گاؤں کا منظر نامہ تقریباً یہی تھا جو ''میرا گاؤں'' میں ملتا ہے۔ خونی رشتہ نہ بھی ہوتا مگر علاقے کا ذکر ہونے کے ناطے ہر بندہ اپنے تئیں، اپنی بساط کے مطابق شادی بیاہ کی تقریب میں حصہ ڈالتا۔ اس منظر کو عہدِ حاضر میں طاہرہ اقبال نے اپنے ناول ''نیلی بار'' میں بھی دکھایا ہے۔ چوں کہ ''نیلی بار'' کی کہانی آج سے قریباً نصف صدی پہلے سے شروع ہوتی ہے لہٰذا اس کا اور ''میرا گاؤں'' کا منظر نامہ ایک سا لگتا ہے۔ چودھری کی بیٹی کی شادی کے حوالے سے غلام الثقلین نقوی نے تفصیل سے دیہی شادیوں کا احوال بتایا ہے کہ شادی کی تقریب میں پورا گاؤں جاگتا ہے۔ چودھری کی حویلی میں شادی کیسی تقریب کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں:

> ''برات کو دوپہر کا کھانا کھلانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دیگیں کھڑک رہی تھیں اور دیسی گھی میں بھُنتے ہوئے مصالحوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کھیل تماشے جاری تھے۔ ڈھوم ڈھاری، بھانڈ اور بازی گر اپنے اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ مولوی صاحب کے آنے پر نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ مبارک سلامت کا شور پہنچا اور باجے والوں نے کچھ دھنیں بجائیں۔ برات کو کھانا کھلایا گیا۔۔۔۔ چودھری کے آنگن میں جہیز کا دکھلاوا ہوا۔ پھر دیکھتے دیکھتے جہیز سمیٹا گیا اور پیٹیوں اور صندوقوں میں بند کر دیا گیا۔ تب کہاروں نے رنگین پردوں والی ڈولی حویلی اور آنگن کے مشترکہ دروازے کے ساتھ لگا دی اور آنگن میں کھڑی عورتیں رونے لگیں۔ روتی ہوئی دلہن کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو باجے والوں نے جو دھن بجائی وہ بڑی دردناک تھی۔''[۱۳]

ان اقتباسات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''میرا گاؤں'' کا مراد پور لوگوں کی جذباتی ہم آہنگی کا مظہر بھی ہے جہاں کے چھوٹے بڑے آپس میں جڑے ہوئے ہیں، ہر خوشی غمی میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ یہ رویہ ہمیں اس دور میں پنجاب کے بیشتر دیہاتوں میں نظر آتا ہے۔ یہ ہمارے پنجاب کا کلچر تھا کہ شادی بیاہ کے موقع پر بھانڈ، میراثی آتے تھے اور لوگوں کو محظوظ کر کے کچھ نہ کچھ روپے لے جاتے تھے یا فصل پر اپنا حصہ وصول کر لیتے تھے مگر اب یہ کردار بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جہیز دکھانے کی رسم بھی

دم توڑتی جا رہی ہے۔ عہدِ حاضر کے تناظر میں دیکھا جائے تو شاید "میرا گاؤں" دیہی ثقافت کا نوحہ لگے گا کہ اب وہ تمام رسوم و رواج، رواداری اور انسان دوستی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ بینڈ باجے والے شادی بیاہ کا ایک اہم جزو ہوا کرتے تھے مگر وہ بھی اب کم کم نظر آتے ہیں۔ یہی پنجاب کی دیہی ثقافت کے مختلف رنگ تھے جو رفتہ رفتہ پھیکے پڑتے جا رہے ہیں۔

انہیں رواجوں میں سے ایک رواج بچے کی پیدائش کے موقع پر کچھ نہ کچھ لے کر جانا ہوتا تھا۔ "میرا گاؤں" میں ماسی ریشم کے کردار کے ذریعے غلام الثقلین نقوی نے اس کی بھی مختصر جھلک دکھائی ہے۔ اگرچہ شعوری طور پر مصنف نے اس پہلو پر نہیں لکھا تاہم ضمناً کہانی میں اس کا تذکرہ موجود ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ غلام الثقلین نقوی پنجابی رہتل کے ہر رنگ سے آشنا ہیں۔ ماسی ریشم جب شہر جاتی ہے تو گاؤں کے لوگ پہلے تو حیران ہوتے ہیں کہ وہ اچانک کہاں چلی گئی ہے وہ شیماں کو گاؤں کی بیٹی سمجھ کر شہر جاتی ہے اور اس کے جانے کا تذکرہ یوں کیا جاتا ہے:

"ماسی ریشم گھی اور گڑ لے کر صبح سویرے منہ اندھیرے گھر سے نکلی اور نجانے کہاں گئی تھی۔"[۱۴]

مگر جب راز کھلتا ہے تو سب پر عیاں ہوتا ہے:

"سَت پتری دھی کا جمنا لے کر گئی تھی۔"[۱۵]

یہ وہ مثالی رویہ ہے جو ہماری دیہی ثقافت کا ایک خاص وصف ہے۔ گاؤں کی بہن، بیٹی کے لیے گاؤں کی بزرگ خواتین کا یہ طرزِ عمل ان کے اخلاص اور ریت رواج کا عکاس ہے جو مشینی دور میں آ کر اپنا رنگ کھو رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ گاؤں کی لڑکی جو بیاہ کر دوسرے علاقے میں جاتی ہے تو اس کی خوشی غمی میں شریک ہونا اس کے گاؤں والے ضروری سمجھتے تھے کیوں کہ ان کا ماننا تھا کہ یہ لڑکی اب ہمارے علاقے کی بیٹی ہے اور اسے دوسرے علاقے میں جا کر بھی اپنوں کا پیار، اخلاص اور سہارا ملتا رہے۔ اگر لڑکی کا کوئی عزیز رشتہ دار نہ ہوتا تو گاؤں کا کوئی نہ کوئی فرد اس کے دکھ درد، خوشی غمی میں شریک ہوتا۔ یہی رویہ ہمیں ماسی ریشم کے کردار کے ذریعے "میرا گاؤں" میں ملتا ہے۔

"یہ ایک ایسا دیہی معاشرت کی عکاسی کرنے والا ناول ہے جو راقم الحروف کے مطابق زندگی کے جلال و جمال کی پیش کش کرتا ہے۔ اس کلاس کا جمال پیار، محبت، خلوص،

رواداری، قربانی، دوستی، کرم نوازی اور انسانی ہمدردی کا ماحول ہے۔"[۱۶]

"میرا گاؤں" کا ایک اور نمایاں وصف غلام الثقلین نقوی کا وہ مشاہدہ ہے کہ جس کے ذریعے وہ گاؤں کے لوگوں کی شناخت کے لیے ان کے حقیقی ناموں کی جگہ عرفیت بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے معاشرے میں اصل نام کی جگہ عرفیت بھی شناخت کا ذریعہ ہوتی ہے مگر شہری اور دیہی علاقوں میں ان میں امتیاز دکھائی دیتا ہے۔ شہری علاقوں میں ہمیں جدید کرداروں یا ذات برادری کے تفاخر کے نام کے حوالے سے عرفیت ملتی ہے مگر یہ ہمارے پنجابی دیہی کلچر کا خاصا ہے کہ یہاں وہ نام جو بچپن میں معروف ہو جاتا ہے وہ آخری دم تک اس فرد کی پہچان رہتا ہے اور بعض اوقات تو لوگوں کو اصل نام سے بھی شناسائی نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہ ہمارے دیہی زرعی سماج میں لوگوں کو ان کے پیشوں اور حیثیتوں کے اعتبار سے جانا جاتا ہے۔ بیشتر اوقات عرفیت کے ساتھ پیشے کا لاحقہ ضرور لگایا جاتا ہے تاکہ "پہچان" ہو سکے۔ کئی جگہ اس میں تحقیر کا عنصر بھی جھلکتا ہے جب کہ بعض ناموں میں اپنائیت کا عنصر بھی ہوتا ہے۔

ناول کی ابتدا میں جہاں کرداروں کے نام تحریر کیے گئے ہیں وہاں بعض کے ساتھ ان کے پیشے یا عرفیت بھی لکھی گئی ہے مگر جب چودھری کی بات ہوتی ہے تو اسے مکمل نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ انداز پنجاب کے دیہی کلچر میں اب بھی موجود ہے مثلاً عبدالرحمٰن جو ناول کا مرکزی کردار ہے اسے ماہنا کی عرفیت سے پکارا جاتا ہے، سلیمان کو سُلی، ریشم بی بی کو ریشو، بابا نتھو خراسیا، دیناتر کھان اس کی بیوی جھنڈو، سیداں بجلی، مہاجر لڑکے کو بھا اسلم جب کہ نمبردار کو چودھری شریف دین کے نام سے پکارا جاتا ہے مگر اس کا اصل نام ہی لیا جاتا ہے۔ اس طرح حمیداں، شیماں، شیفاں ڈھولک وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ ناول میں کئی جگہ ذات پات کی تفریق کو بھی بین السطور دکھایا گیا ہے جو ہمارے پنجابی سماج کی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔

"وہ گاؤں کا کمیرا ہے اور تمہارا باپ جاٹ ہے۔ چوہدی کے بیٹے کا کمیروں سے کیا جوڑ۔"[۱۷]

پنجابی دیہات کی ثقافت کا ایک اہم عنصر اس کے کھیل، تماشے بھی ہیں۔ اس ناول میں کئی جگہ ہمیں مختلف مقامی کھیلوں کے حوالے بھی ملیں گے۔ یہ وہ کھیل ہیں جو رفتہ رفتہ ختم ہوتے جا رہے ہیں اور آج کل کے دور میں ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا مگر غلام الثقلین نقوی نے ماہنے اور سُلی کے کرداروں کے ذریعے ان میں سے کئی کھیلوں کا تذکرہ کیا ہے مثلاً شیماں کا ماہنے کے ہمراہ "شاہ شٹاپو" کھیلنا، یہ دیہی ثقافت کا

عام چلن تھا کہ لڑکا اور لڑکی اکٹھے ایسے کھیل کھیلا کرتے تھے جب تک کہ وہ بڑے نہ ہو جاتے تھے۔ شاہ شٹاپو کھیلنے کا انداز مصنف نے ناول میں کچھ یوں دکھایا ہے:

> ''ہم نے خانے بنا کر شاہ شٹاپو کھیلنا شروع کیا۔ شیماں ایک ٹانگ پر کھڑی ٹھیکری کو دوسرے پاؤں سے ٹھوکر لگا کر خانے سے باہر نکالنے ہی والی تھی۔''[۱۸]

جب کہ دوسرے کھیلوں کا ذکر بھی ملتا ہے:

> ''جب اتوار کو یا کوئی اور چھٹی ہوتی تو میں اس کے ہاں ریٹھے کھیلنے کے لیے چلا جاتا۔''[۱۹]
> ''کبھی کبھار شام کو گاؤں آجایا کرو۔ گلی ڈنڈا کھیلیں گے۔''[۲۰]

یعنی روایتی کھیلوں کا یہ تذکرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غلام الثقلین نقوی نے گاؤں کی فضا کا ایک بھرپور اور مکمل تاثر ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

یہ تمام عوامل مل کر دیہی ثقافت کی ایک ایسی دلکش تصویر بناتے ہیں کہ جو پنجابی رہتل کا وصف ہے۔ سیاسی و سماجی عوامل، رسہ کشی، استحصال کے ساتھ ساتھ یہ تمام پہلو بھی جب تک نہ دکھائے جائیں تو شاید ثقافت کا ایک جمالی پہلو بھی سامنے نہ آئے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو میرا گاؤں کے تناظر میں پورے پنجاب کے دیہی علاقوں کی رہتل کو دکھایا گیا ہے۔ قاری خواہ پنجاب کے کسی بھی دیہی علاقے سے تعلق رکھتا ہو، اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مصنف کے کیمرے کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے اور یہ تمام تصویریں اس کے اپنے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس ناول میں کوئی بہت بڑا فلسفہ یا شدت سے کرداروں کے باہمی ٹکراؤ کا تذکرہ نہیں ملے گا البتہ کہانی کے ساتھ ساتھ ثقافتی جھلکیاں ضرور ملیں گی۔ ''میرا گاؤں'' کے حوالے سے ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' سے اقتباس دیکھیے:

> ''اس میں کوئی فلسفہ یا غیر ضروری بات نہیں ہے لیکن اس میں یہ نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے کہ معاشرے میں آدمی کے مسائل اور دکھوں کا علاج اعلیٰ انسانی اقدار کے احترام میں مضمر ہے۔۔۔۔ ان کے کردار دیہاتی زندگی کے زندہ اور جیتے جاگتے کردار ہیں جو تکلف اور بناوٹ سے یکسر خالی ہیں۔ ان میں سادگی ہے اور معصومیت بھی۔''[۲۱]

''میرا گاؤں'' میں کچھ ایسے اشارے ضرور ملتے ہیں کہ جن میں اس اندیشے کا اظہار کیا گیا ہے کہ چک مراد کی سادگی اور معصومیت کو عہد جدید یا مشینی دور کی وجہ سے جلد ہی ایک نئی فضا دیکھنے کو ملے گی جس میں خوبصورتی کی جگہ بدصورتی، معصومیت اور اپنائیت کی جگہ مغائرت یا بیگانگی لے لے گی۔ غالباً یہی اندیشہ غلام الثقلین نقوی کو دمِ تحریر بھی تھا کہ ایسے مخصوص علاقے اب اپنا حسن جلد کھو دیں گے۔ اگرچہ انھوں نے جنگ کے بعد گاؤں کی حالت کا تذکرہ کیا ہے مگر اس میں بھی کچھ خدشات کا اظہار ضرور ملتا ہے۔

ماہنا جب مولوی صاحب سے ملتا ہے تو گاؤں کو دیکھ کر کہتا ہے:

> ''میری دنیا تو میرا گاؤں ہے۔ یہ بستی اجڑ گئی تو سمجھو ساری دنیا اجڑ گئی۔ اجڑے ہوئے کنویں پر پہنچ کر میں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ مجھے دور دور تک اجاڑ بیابان نظر آیا تو میرا دل بنجر ہو گیا۔۔۔ منڈیروں سے اینٹیں اکھڑ کر کنویں میں گر گئی تھیں اور میری ڈھاری کی چھت بیٹھ گئی تھی۔ جس علاقے میں درخت نہ رہیں وہاں سے پنچھی اُڑ جاتے ہیں۔''[۲۲]

اس اندیشے کا مختصر اظہار غلام الثقلین نقوی نے دیباچہ میں بھی کیا ہے کہ ممکن ہے کہ آئندہ پندرہ بیس سالوں میں وابستگی اور ہم آہنگی کی یہ کیفیت گاؤں کی سماجی زندگی سے غائب ہو جائے۔ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل، بجلی اور کھاد کی وجہ سے ممکن ہے کہ یہ فاصلہ بڑھ جائے۔[۲۳] اور ہم یقینی طور پر اس تقلب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ غلام الثقلین نقوی، میرا گاؤں (لاہور: ضیائے ادب، ۱۹۸۲ء)، ۷۔

۲۔ ایضاً، ۳۱۔

۳۔ ڈاکٹر طارق مجید، اردو ناول میں دیہی معاشرت (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۲۲ء)، ۳۸۔

۴۔ غلام الثقلین نقوی، میرا گاؤں، ۲۴۔

۵۔ ایضاً، ۳۳۔

۶۔ ایضاً، ۲۵۱۔

۷۔ ایضاً، ۱۷۰۔

۸۔ ڈاکٹر محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور (اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع دوم ۲۰۱۵ء)، ۲۵۷۔

۹۔ غلام الثقلین نقوی، میرا گاؤں، ۵۸۔

۱۰۔ ایضاً، ۱۱۴۔

۱۱۔ ڈاکٹر طارق مجید، اردو ناولوں میں دیہی معاشرت، ۱۲۶۔

۱۲۔ غلام الثقلین نقوی، میرا گاؤں، ۱۸۸۔

۱۳۔ ایضاً، ۱۹۰۔

۱۴۔ ایضاً، ۱۸۰۔

۱۵۔ ایضاً، ۱۸۱۔

۱۶۔ ایضاً، ۱۶۳۔

۱۷۔ ایضاً، ۴۲۔

۱۸۔ ایضاً، ۴۱۔

۱۹۔ ایضاً، ۱۶۔

۲۰۔ ایضاً، ۱۰۴۔

۲۱۔ پروفیسر خواجہ محمد زکریا، (مدیر)، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد پنجم (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، طبع دوم ۲۰۱۲ء)، ۵۴۹۔

۲۲۔ غلام الثقلین نقوی، میرا گاؤں، ۳۴۵۔

۲۳۔ ایضاً، ۶۔